رُلا اس بے چاری کو رہی ہے۔ اس عمر میں ایسے مذاق نہیں کیا کرتے"۔

پھر سب معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن رات جب میں سونے لگی تو ایک بار پھر آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے اور میں ہاتھ مروڑتی ہوئی کہنے لگی:

"اللہ میاں کرے باجی تو مر ہی جائے ـــــ مر ہی جائے بالکل ساری کی ساری"۔

باجی میری بددعا سے مر تو نہ سکی۔ ہاں ہمارا گھر چھوڑ کر ضرور چلی گئی۔ انہیں یوسف بھائی کے ساتھ کار میں بٹھا کر ہم سب واپس لوٹے تو آتے ہی میں نے دن رات بجنے والی ڈھولک کو پیر مار کر پھاڑ دیا اور بستر پر اوندھی لیٹ کر رونے لگی۔

سارے گھر میں باسی پھولوں اور پلاؤ فرنی کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہر ایک کسی نہ کسی کونے میں بیٹھا باجی کی کمی محسوس کرتا ہوا افسردہ ہو رہا تھا لیکن مجھے باجی کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کا غصہ بھی آ رہا تھا۔ ساری شام انہوں نے مجھے بھگا بھگا کر پیر چھلنی کر دیے تھے، پھر بھی جو کوئی تھا ان ہی کی تعریف کر رہا تھا انہیں ہی گھور رہا تھا۔ خالہ نے شام کے دوران میں بس ایک مرتبہ مجھ پر عنایت کی جو پوچھا تھا:

"اب کس جماعت میں ہو تہمینہ ـــــ؟"

"جی دسویں میں ـــــ"

اس پر وہ ہنس کر بولی تھیں ـــــ "چلو اب تمہاری باری آئے گی ـــــ"

پھر جب باجی اپنے چھوٹے سے بچے کو لے کر ہمارے ہاں آئیں تو ان کا بچہ دیکھ کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سنہری بال، سفید رنگت اور کنچوں ایسی نیلی نیلی آنکھیں ـــــ لیکن میں نے دیکھا کہ یوسف بھائی میں پہلے سے بہت فرق آ چکا تھا۔ ناک کے دونوں طرف گہری لکیریں پڑ چکی تھیں اور وہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ باجی سارا سارا دن اپنے بچے کو گود میں لیے کھیلتی رہتی اور میں کنکھیوں سے دیکھتی، یوسف بھائی بے چینی سے منتظر رہتے کہ کب باجی کو فرصت ہو اور وہ اُن سے بھی بات کرے۔ ایسے میں میں یوسف بھائی کے

پاس جا بیٹھتی اور ان سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ ہوائی جہازوں کی اونچی اڑانوں پر مجھے ساتھ لے جاتے۔ ایسے ناگہانی حادثات بیان کرتے کہ دل ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح چلنے لگتا —— پھر ان کی نیلی آنکھوں میں موت سے کھیلنے والے پائلٹ کا سا خوف آجاتا اور وہ اپنے بچے سے بھی کم عمر نظر آتے۔ میرا جی چاہتا کہ ان کے سنہری بالوں میں انگلیوں کو ڈبو کر کہوں:

"موت سے کیوں ڈرتے ہو۔ وہ تو اپنے پلنگ پر بھی آجاتی ہے"۔

اگر یوسف بھائی کے کچھ اپنے فکر تھے تو ان میں باجی شامل نہ تھیں۔ وہ تو ان چھوٹی موٹی جھلاہٹوں میں بھی یوسف بھائی کے ساتھ شامل نہ ہوتیں جو عموماً میاں بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کی شکل اختیار کر لیا کرتی ہیں۔

یوں تو روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا لیکن اس دن یوسف بھائی غسلخانے میں گھسے ہی تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ اندر کوئی تولیہ نہیں ہے اور ابھی وہ نہا کر تولیے کے لیے پکاریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے باجی کو پکارنا شروع کر دیا۔ باجی اندر پلنگ پر بیٹھی ننھے کو پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی تو میں غسل خانے کے کواڑ کے پاس جا کر بولی:

"کہیے بھائی جان ——"

"بھئی ذرا تولیہ پکڑانا تہمینہ ——"

میں تولیہ لے کر گئی تو وہ کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے سر نکالے کھڑے تھے۔ دُھلے دُھلائے چہرے پر شہد کی بُوندوں کی طرح پانی کے قطرے لڑھک رہے تھے اور نیلی کنچوں جیسی آنکھیں بالکل زمرّدیں لگ رہی تھیں۔ گیلے بازو پر تولیہ رکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا:

"اور ملکہ صاحبہ کیا کر رہی ہیں؟"

گو میں جانتی تھی کہ باجی کو کوئی ایسا کام نہ تھا لیکن میں بولی —— "جی وہ ننھے کو دودھ پلا رہی ہیں"۔

وہ کواڑ بند کرتے ہوئے بولے:

"اگر انہیں فرصت بھی ہوتی تو بھی وہ کب آتی تھیں۔"

پھر وہ اونچے اونچے کہنے لگے۔ "تہمینہ! شادی کے بعد اپنے شوہر کا خیال ضرور رکھنا اچھا ــــ!"

ایسی کئی ننھی ننھی باتیں ان بڑے بڑے ناگوں کی طرح میرے ذہن میں ابھر رہی تھیں جن پر ایک کالا بدہیئت انجن شنٹ کر رہا ہے اور جسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہماری گاڑی چل رہی ہو۔ اس بدہیئت انجن کی طرح ایک خیال میرے دل میں آگے پیچھے چکر لگا رہا ہے ــ اگر یہ خیال چند لمحے کے لیے مجھے چھوڑ دیتا تو میں بھی بڑی آپا، آپا زینب اور امی کی طرح تھوڑی دیر کے لیے سو جاتی۔

اور سونا تو اُس رات بھی ممکن نہ تھا جب یوسف بھائی کے سر میں بلا کا درد اٹھا تھا ــ پہلے تو باجی کچھ دیر بیٹھی دباتی رہی۔ پھر جب ننھا رونے لگا تھا تو وہ اسے چپ کرانے کیلیے اٹھیں اور اسے تھپکتے تھپکتے خود بھی سو گئیں۔ یوسف بھائی کروٹیں بدلتے ہوئے کراہ رہے تھے بڑی آپا نے اسپرو کھلائی مگر افاقہ نہ ہوا۔ امی نے پانی دم کر کے پلایا۔ درد ویسے ہی رہا ــ پھر میں خود بخود اٹھ کر ان کے سرہانے جا بیٹھی اور ان کا سر دبانے لگی۔ سنہری بالوں پر بندھا ہوا سرخ ریشمی رومال میں نے کھول دیا۔ یوسف بھائی نے میری طرف دیکھا اور تکیے پر ڈلا ہوا سر میری جانب اور کھسکا دیا۔

آہستہ آہستہ یوسف بھائی سو گئے۔ ان کا سانس میرے زانو کو چھونے لگا۔

اس رات میں نے کتنی ہی انجانی راہوں پر ڈرتے ڈرتے قدم دھرنے کے خواب دیکھے اور یہ شاید انہی خوابوں کا نتیجہ تھا کہ میں سر دباتے دباتے اونگھ گئی۔

جب باجی نے مجھے جگایا تو میرے ہاتھ یوسف بھائی کے بالوں میں تھے اور دوپٹہ ان کے چہرے پر پڑا تھا ــ پتہ نہیں کیوں اس وقت بھی مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں

نے تخت سے چابیاں اٹھا کر نعمت خانے سے مٹھائی نکالی تھی ــــ!

اگر صبح ہی باجی اپنے گھر جانے کا پروگرام نہ بنا لیتیں تو شاید اتنی شدید نفرت میرے دل میں کبھی پیدا نہ ہوتی ــــ لیکن ادھر باجی اور یوسف بھائی اپنے گھر روانہ ہوئے اور ادھر میں غم و غصہ سے رونے لگی۔ بار بار مجھے یوں لگتا جیسے باجی جی ہی جی میں مجھ پر الزام دھرتی گئی ہیں۔ جتنا میں باجی کے الزام کے متعلق سوچتی اتنا ہی مجھے اپنے بے قصور ہونے کا خیال آتا۔ اور جب میرا بس نہ چلتا تو میں تکیے میں منہ دے کر کہتی:

"اللہ میاں جی! باجی تو مر ہی جائے بالکل ساری کی ساری ــــ"

لیکن اب یہی خیال بدہیئت انجن کی طرح میرے ذہن کو کوٹ رہا تھا ــــ مجھے پورا یقین ہے کہ میری بددعا نے باجی کی جان لی ــــ وہ انفلوئنزا سے نہیں اپنی بہن کی بددعا سے مر گئی ہے ــــ اور اب جب وہ مر گئی ہے تو میں اُسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ بددعا میں نے جی سے نہ دی تھی ــــ سٹیشن کی بے رونق بتیوں کی طرح باجی کے گلے میں باسی مرجھائے پھول ہوں گے اور وہ ڈرائے دھمکائے بغیر مجھے مل کر پوچھے گی: "بولو اب تو خوش ہو؟ ــــ اب تو خوش ہو؟ ــــ"

گاڑی دھچکا کھا کر چلنے لگی ہے۔ بدہیئت کالا انجن ہم سے دُور ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کرتا پیچھے رہ گیا ہے۔ امی، بڑی آپا اور آپا زینب ایرانی بلیوں کی طرح سیٹوں پر پڑی سو رہی ہیں ــــ لیکن احساسِ گناہ کا ہزار پایہ ہولے ہولے میری گردن پر رینگ رہا ہے ابھی وہ میرے منہ پر آجائے گا اور میری آنکھوں میں سوئیوں ایسے پاؤں گاڑ دے گا!

اقبالِ جُرم

مجھے اب بھی یقین ہے کہ جس مصلحت کے پیشِ نظر اُس نے اقبالِ جرم کیا تھا، وہ اس کے اعتراف سے بہت مختلف تھی۔

جس وقت نذیر کو سزا کا حکم ہوا میں کورٹ میں موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اس میں دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ مجھے میری دلچسپی کورٹ سے باہر لے گئی۔ میں نے اپنی سائیکل کو وہیں باہر سائیکل سٹینڈ پر چھوڑا اور قریبی ریستوران میں جا کر چائے پینے لگا۔

اس سہ پہر کو مجھے ساری دنیا اداس اور بھیانک نظر آئی۔ باوجودیکہ ریستوران میں چاروں طرف رنگین کاغذ کی کترنیں اور رنگ برنگے بلب روشن تھے لیکن آنے والی ۲۵ دسمبر کی خوشی میں چھت سے لٹکنے والی رنگین لالٹینیں اور غبارے مجھے بیحد بے ہودہ نظر آ رہے تھے اور لٹکی ہوئی کترنوں پر مجھے صلیب کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر ایک صلیب پر نذیر آویزاں تھا — اس کی ہتھیلیوں سے لہو بہ رہا تھا۔ پاؤں زخمی تھے اکڑی ہوئی گردن کی نسیں پھولی ہوئی تھیں لیکن اس کا چہرہ عجب سکون سے لبریز، نہایت مطمئن تھا۔

میں نے آدھی پیالی پی کر چہرہ پرے کر لیا۔
کوئی طاقت بار بار مجھے کورٹ روم کی طرف بلا رہی تھی لیکن میں صلیبی کتروں سے منہ پھیر کر پیالی پر نظریں جمائے سوچنے لگا اگر نذیر کی جگہ میں ہوتا؟ — اگر نذیر کی جگہ رفیق ہوتا؟ — اگر — ؟

جس روز عذرا کا قتل ہوا، اس روز صبح صبح میں اور نذیر موٹر سائیکل پر چڑھ کر اس کی گلی میں سے نکلے تھے۔ میری نئی موٹر سائیکل کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑ کر نذیر نے کہا تھا:

"یار! ذرا محبوب کی گلی میں سے گزرتے ہیں۔ ایسی باتوں کا ان لڑکیوں پر بڑا رعب پڑ جاتا ہے۔"

جس وقت ہم موٹر سائیکل پر دندناتے اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے وہ لوہے کی سلاخوں والے پھاٹک کے پاس کھڑی سویٹر بُننے میں مشغول تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے لوہے کے پھاٹک پر پیر جمائے جنگلے کی سلاخوں کو پکڑے جھول رہے تھے اور ان تینوں سے کچھ فاصلے پر مالی فوارے کے ساتھ پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔

ان کی کوٹھی سے تھوڑی دیر پہلے نذیر نے موٹر سائیکل کی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ اس کا سرخ مفلر ہوا میں پھڑپھڑانے لگا تھا اور اس کی گردن بالشت بھر لمبی ہو کر پیلی کوٹھی کی طرف مڑ گئی تھی۔ ان کی کوٹھی سے دس قدم آگے عین بس سٹاپ کے پاس نذیر نے موٹر سائیکل روک کر میرے سپرد کی تھی اور پھر بغیر کچھ کہے سُنے پیلی کوٹھی کی طرف چل دیا تھا۔

جب نذیر واپس آیا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے

موٹر سائیکل کو سٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے مجھے کہا تھا:

"بخدا ـــ! میں اس کو مزہ چکھا دوں گا۔ یونہی کسی کے دل سے کھیلنا آسان نہیں ہوتا۔ تم دیکھ لینا اس نے مجھ پہ رفیق کو ترجیح دی ہے لیکن اسے رفیق تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔"

جب کورٹ نے میری گواہی طلب کرتے ہوئے اِن الفاظ کی تصدیق چاہی تھی تو اثبات میں سر ہلانے کے باوجود مجھے پورا یقین تھا کہ ان الفاظ کا نذیر کے عزم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ـــ وہ الفاظ نذیر نے جوش اور غصے میں کہے تھے۔ ان کی صداقت کی تصدیق چاہنا ہی فضول تھا۔

مجھے تو وہ رات بھی خوب یاد ہے جب میں اور نذیر رات گئے تک سڑکوں پر ٹہلتے رہے تھے۔ میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن نذیر کا قصہ ختم نہ ہوتا۔

میں اس کے اور عذرا کے تمام حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے مجھے ایک ایک دن، ایک ایک ملاقات کی رُوداد یوں سنائی تھی جیسے کوئی فلمی کہانی سُنا رہا ہو ـــ ہر ایک واقعے کو بیان کرنے کے بعد وہ مجھ سے پوچھتا:

"اور اب تم ہی انصاف کرو کہ اسے مجھے چُننا چاہیے تھا کہ رفیق کو؟"

اور جب میں اس کے حق میں ووٹ دے کر خاموش ہو جاتا تو پھر وہ نئے سرے سے اپنی داستانِ خونچکاں سنانے بیٹھ جاتا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ لارنس باغ کے وسط میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا تھا:

"آخری بار مجھے عذرا کو دیکھنا ہے۔ آخری بار۔"

اور یہ کہہ کر وہ مجھے وہیں چھوڑ کر چل دیا تھا۔

یوں گھنٹے کے بعد جب ہم سڑکوں پہ گھومتے گھامتے گھر پہنچے تو باہر کی بتی کے نیچے

گھر کے تمام افراد جمع تھے۔ امی کے سر پر دوپٹہ نہ تھا۔ بہنوں کے پیروں میں سلیپر تک نہ تھے۔ نذیر کو دیکھتے ہی یکبارگی سب خاموش ہو گئے اور پھر ننھی یاسمین نے امی اور خالدہ کے درمیان میں سے سر نکال کر کہا:

"بجو بھائی! ـــ آپا عذرا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

نذیر یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

نذیر نے جیسے آسمان سے پوچھا: "کب؟ کب؟ ـــ"

میں آپ سے بھی کہتا ہوں اور کورٹ میں بھی میں نے فاضل جج سے یہی کہا تھا کہ نذیر نے عذرا کا قتل کیا ہوتا تو وہ اس کرب سے گھر والوں سے نہ پوچھتا کہ عذرا کو کب کسی نے قتل کر دیا؟

میں جانتا ہوں وہ مجھ سے آدھ گھنٹہ علیحدہ ہو کر عذرا کے گھر گیا تھا۔ کورٹ میں وہ بھی یہی کہتا رہا کہ اسی آدھ گھنٹے میں اس نے عذرا کے سینے میں چھری گھونپی تھی۔ عذرا کے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی خوبصورت جرمن چھری سے اس کا سینہ چاک کیا تھا لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا کہ عذرا کا قاتل نذیر ہے!

ہوٹل میں لٹکی ہوئی رنگین صلیبی کترنوں پر نذیر آویزاں تھا۔ اس کی ہتھیلیوں سے لہو رواں تھا۔ پاؤں زخمی تھے لیکن چہرے پر نجات اور سکون کا غازہ لگا ہوا تھا۔ میں چائے پیے بغیر عدالت میں واپس چلا گیا۔

لیکن تب تک نذیر جا چکا تھا۔ امی اور ابا بھی رخصت ہو چکے تھے اور کورٹ روم کے باہر بیٹھا ہوا چپراسی کہہ رہا تھا:

"بابو جی! مجھے یقین نہیں آتا کہ نذیر میاں نے قتل کیا ہے۔ قاتلوں کے چہرے ایسے نہیں ہوتے ـــ کہیں جو یہ اپنے منہ سے نہ مانتے تو کاہے کو سزا ہوتی!"

میں نے سائیکل سٹینڈ پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل نکالی اور جیسے اپنے آپ سے کہا:
"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ نذیر نے عذرا کا قتل کیا تھا۔ ہاں جس مصلحت کے پیشِ نظر اس نے اقبالِ جرم کیا تھا وہ کچھ اور تھی!"

بھلا عذرا کے بغیر زندہ رہ کر نذیر کرتا بھی کیا! شاید وہ خودکشی کر لیتا!!

شاید کسی روز پچھلی رات کا سرد چاند اس کی چارپائی پر جھانکتا اور اسے نہ پا کر بادلوں میں چھپ جاتا!

پھر آپ ہی بتائیے اگر نذیر نے اپنے ہاتھوں ایسی موت چن لی تو آپ اور میں اس پر کیونکر الزام دھر سکتے ہیں!!!

الزام سے الزام تک

عجیب سی بات ہے کہ ہر سال سردیاں آتی ہیں اور ہر سال سردیوں کے کپڑوں کا انتظام نہیں ہو پاتا۔ میں اور میری بیوی کپڑوں کے متعلق آپس میں صلاح مشورے کرتے ہیں فلالین کی صدریاں، اونی ٹوپیاں، گرم سوٹ، سمر کی قمیصیں، ڈبل نٹ جرسیاں، پشم دار دستانے اور گرم جرابوں کا ذکر ہماری گفتگو میں عام رہتا ہے لیکن جس وقت نیفتا کی سفید سفید گولیاں جو ساری گرمیاں پرانے گرم کپڑوں میں رہنے کے باعث گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں اور ان گولیوں کا جھڑاؤ پچھلے سال کے کپڑوں سے ہوتا ہے تو میری بیوی سہمی ہوئی میری طرف دیکھتی ہے۔ وہ بھی جانتی ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ اس سال بلکہ آنے والے کئی اور سال سردیاں آتی رہیں گی اور گرم کپڑوں کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکے گا۔

خدا جانے کیا وجہ ہے آج سے دس سال اُدھر ایک سویٹر میں گزارہ ہو جاتا تھا۔ اب بنیان کے اوپر سویٹر قمیض کے اوپر سویٹر اور سویٹر کے اوپر کوٹ کے باوجود ہاتھ شل ہو جاتے ہیں اور موٹر سائیکل کی ہتھی اکڑے ہوئے ہاتھوں سے پکڑی نہیں جاتی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام لوگوں میں دنیا بھر کی دولت برابر بانٹ

دی جائے تو پھر غالباً گرم کپڑوں کی کمی کا احساس اس قدر نہ ہو اور سبھی ایک ایک سویٹر میں تالیاں بجاتے، منہ سے بھاپ اڑاتے اور مونگ پھلیاں چباتے نظر آئیں لیکن میری بیوی کا خیال ہے کہ سردی کا احساس ہی ایسا ہے جس میں گرم کپڑوں کا خیال خواہ مخواہ آتا ہے جیسے جوانی میں عشق و محبت کے خواب۔ دولت کی صحیح یا غلط بانٹ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کبھی کبھی اخبار میں اٹامک ریسرچ والوں کے تجربوں کے متعلق خبریں پڑھ لینے کے بعد میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں ـــــ بھلی لوگ! کچھ ہم تم بوڑھے نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ ان تجربوں کی وجہ سے جغرافیائی حالتیں بدل رہی ہیں۔ جو پہلے سمندر تھے اب بحیرے بن رہے ہیں۔ بحیروں نے تنگناؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سطح مرتفع میدانوں میں بدل رہے ہیں اور میدانوں میں ریگستانوں کی خاصیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ موسموں کا اعتبار کیا؟ دیکھ لو دسمبر کی پچیس تاریخ جا رہی ہے اور ابھی تک خشک سردی پڑ رہی ہے۔ کبھی یہ بھی سنا تھا کہ کرسمس کی چھٹیاں ہوں اور آسمان ابر آلود نہ ہو ـــــ!

میری بیوی کو سردی لگتی ہے لیکن وہ میری طرح یا جولا ہے کے داماد کی طرح سردی میں ٹھٹھر نہیں جاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے جسم کو جوانی میں معلوم تھا کہ ابھی آنے والے کئی سالوں تک گرم کپڑوں کا صحیح انتظام نہ ہو سکے گا اور درختوں کی طرح، جو سردیوں کی ساری خوراک اپنے پتوں میں جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے پٹھوں کے ارد گرد اس کے ہوش مند اور دور اندیش جسم نے چربی کی فوم ربڑ چڑھا رکھی ہے۔ بدقسمتی سے میرا جسم کبھی میرا دوست نہ تھا۔ ساری جوانی اس نے جو کھایا خدا جانے کہاں گنوایا؟ اب عالم یہ ہے کہ لوگ کپڑے گھلواتے ہیں اور میں پچھلے کپڑوں کو تنگ کر کر کے پہنتا ہوں۔

میری بیوی کو ایک اور فائدہ بھی ہے۔ گھر میں ننھا سا پوتا ہے جو سارا دن دادی کی بغل میں بیٹھا رہتا ہے۔ ایک تو چولہے کا سینک۔ دوسرے بچے کی گرم بوتل اسے گرمائے رکھتی

اسی لیے جب میں دوسروں کے گرم کپڑوں کا ذکر کرتے کرتے ناشکرا ہو جاتا ہوں تو میری بیوی میرا نقطۂ نظر سمجھ نہیں پاتی اور مجھ سے متفق ہونے کے بجائے مجھ سے الٹا لڑنے لگتی ہے کیونکہ لڑنے بھڑنے کی اسے کافی پریکٹس ہو چکی ہے اور نان سٹاپ کئی کئی پیراگراف اُسے ازبر ہیں اس لیے اس طرح لڑنے جھگڑنے میں بھی اسی کا فائدہ ہے کیونکہ تنفس تیز ہو جانے سے لہو کی گردش میں سستی نہیں رہتی اور وہ کئی گھنٹوں کے لیے گرم ہو جاتی ہے۔

کئی سال سے میں اپنی بیوی کو باتوں باتوں میں اس بات پر رام کر رہا ہوں کہ ہم گھر کی یہ تکلیف بآسانی لنڈے بازار سے حل کر سکتے ہیں لیکن میری بیوی ان لوگوں میں سے ہے جو کھلے بناسپتی گھی کو دیسی گھی کے دام پر منگوا کر خوش ہوتے ہیں اور محلے بھر میں اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے کبھی بناسپتی گھی اور لنڈے کا کپڑا استعمال نہیں کیا اور اکنی کبھی کسی سے ادھار نہیں لی۔ ایسی عورت جو اصولوں میں ذرا سا لاسٹک بھی استعمال نہ کرتی ہو ایسی عورت کو اپنی ضرورت جتائی تو جا سکتی ہے لیکن منوائی نہیں جا سکتی۔

میرا بوس تین ہزار ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ اس کی انشورنس پالیسیاں دو لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ آٹھ نہری مربعے جھنگ میں اور دو کوٹھیاں گلبرگ میں۔ دو کاریں وردی پوش ڈرائیوروں سمیت بغرض آمد و رفت رکھتا ہے — میرے بوس نے اسی سال جب تین سوٹ میرے ساتھ لنڈے میں جا کر خریدے اور بار بار دکاندار سے کہا کہ یہ سوٹ اس کے پی اے کے لیے ہیں تو میں نے بھی جو ساتھ ہی تھا، ڈرتے ڈرتے ایک بڑا کوٹ اپنے لیے خرید لیا۔ میرا خیال تھا کہ صاحب میری خدمات سے خوش ہو کر یہ تین سوٹ مجھے عنایت کر رہا ہے لیکن واپس دفتر جانے کی بجائے ہم ایک ایسے ٹیلر کی دکان پر پہنچے جو آلٹریشن میں بے مثل ہے۔ اور جس کے ہاں سے پرانا کپڑا نکل کر ریڈی میڈ کپڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے چونکیل جانور کی طرح کان کھڑے کیے اور ابھی اپنا پرانا کوٹ اتارنے کے ارادے ہی کر رہا تھا کہ میرے بوس نے ٹیلر کے سامنے اپنے آپ کو ناپ کے لیے پیش کر دیا۔

انچاس، باون اور چالیس کا بے مثال ناپ دے کر اور ٹیلر ماسٹر کو اَن گنت ہدایات دینے کے بعد ہم لمبی سیاہ کار میں روانہ ہو گئے۔ مجھے سوٹ نہ ملنے کا اتنا رنج نہ تھا جس قدر اوور کوٹ کے پا لینے کی خوشی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ میں لنڈے کا کوٹ لے کر گھر نہیں جا سکتا تھا ـــــ میری بیوی کی محلّے بھر میں ساکھ تھی اور وہ اپنے آپ کو میرے بوس سے زیادہ خاندانی سمجھتی تھی۔ اس کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا ہی بہت مشکل تھا کہ یہ کوٹ پرانے کوٹوں کی نئی گانٹھ سے نکلا ہے۔ دفتر کے غسلخانے میں جب پہن کر میں نے اسے دیکھا تو ایک دم مجھے اپنی تنخواہ میں چار سو روپے کی ترقی نظر آنے لگی۔ اپنے کھچڑی پکے بالوں پر پرسنلٹی کا شبہ ہونے لگا۔ جوں جوں میں اپنے آپ کو دیکھتا، اپنے آپ سے اور کوٹ سے محبت بڑھتی جاتی۔

جس وقت میں گھر پہنچا تو کوٹ میرے بازو پر یوں تھا کہ جیسے بڑے صاحب کے منہ میں پائپ

"یہ کوٹ کہاں سے ملا ـــــ؟" میری بیوی نے اپنے ننھے پوتے کو گود سے اتار کر پوچھا۔

"خلیق نے دیا ہے۔ اس کے ماموں کویت سے لائے ہیں ـــــ"

دفتر میں میرا ایک ساتھی خلیق تھا جو اپنے بجھے ہوئے سگریٹ کا ٹوٹا بھی کسی کو لینے نہیں دیتا تھا۔ اس کے متعلق ایسی سخا شاہی فراخ دلی کو منسوب کر کے مجھے ہنسی سی آ گئی۔

"لیکن وہ تو بہت کنجوس ہے اس نے کوٹ کیسے دے دیا ـــــ؟"

"تمہارا خیال ہے مفت دیا ہے؟ پورے تیس روپے دیے ہیں اُسے۔"

کوٹ کو دوربین جیسی نظروں سے دیکھ کر میری بیوی بولی ـــــ "تیس روپے کا؟ ایسا بڑھیا کوٹ؟ ـــــ دیکھنا جی کہیں لنڈے کا ہی نہ ہو ـــــ"

"لنڈے کا؟ ـــــ بتا تو رہا ہوں کہ خلیق کے ماموں لائے ہیں کویت سے ـــــ

مجھ سے اس نے تیس روپے لیے۔ کیونکہ ایک طرح کے دو کوٹ آ گئے تھے حسنِ اتفاق سے۔"
کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ نکال کر باہر نکالتے ہوئے میری بیوی آہستہ سے بولی ــــ
"کچھ دل مانتا نہیں ہے ــــ"

میری بیوی ان بیویوں میں سے ہے جو ساری جوانی اعتبار کرتی ہیں بات مانتی ہیں۔ مرد کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی شکایتاً نہیں نکلتا ــــ اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچتے ہی ان کی گاڑی پیچھے کی طرف شنٹ کرنے لگتی ہے۔ جس طرح پہاڑی علاقوں میں لاکھ زور لگانے پر بھی انجن پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ میری بیوی عورتوں کی اس جنس سے تعلق رکھتی تھی جس سے بروٹس کی بیوی رکھا کرتی تھی۔ جو کچھ بھی ہو جائے دل میں مشک نافے کی طرح بند رکھنے والی ــــ لیکن یہ بیس برس پہلے کی بات ہے۔

اس واقعے کا تعلق میری شادی سے ہے۔ میری اور میرے چچا زاد بھائی اعجاز کی شادی ایک ہی دن ایک ہی گھر میں دو سگی بہنوں کے ساتھ ہو رہی تھی اور ہماری سعادت مندی یہ تھی کہ ہم دونوں نے اپنی ہونے والی بیویوں سے بات کرنا تو درکنار، اُن کی تصویر تک نہ دیکھی تھی۔

شادی سے کوئی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے کہ اعجاز جو بڑا شاعر طبع تھا اور جسے صنفِ نازک کے حقوق اور ان کے دل کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا، میرے کمرے میں آیا۔ میں اس وقت ایک ایسی کتاب پڑھ رہا تھا جس میں شادی کی ہائیجین پر بڑے بسیط مقالے لکھے ہوئے تھے۔

"ایک بات کرنا تھی تم سے ــــ لیکن تم شاید پڑھ رہے ہو؟ ــــ"

میں نے شادی اور ہائیجین کے صفحہ ۲۱۲ پر انگوٹھا پھنسا لیا اور بولا ــــ "نہیں نہیں آؤ بیٹھو ــــ"

اعجاز میں ایک فطری اضطراب ہے جیسے پارے میں ہوا کرتا ہے۔ وہ زیادہ دیر ایک رُخ پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر بیٹھ بھی جائے تو پندرہ منٹ کی نشست میں چار منٹ ٹانگیں ہلاتا

رہے گا، چھ منٹ ناک، کان اور دانتوں تک اس کی انگلیاں آتی جاتی رہیں گی۔ دو ایک منٹ کالر کی درستی پر صرف ہوں گے اور باقی ماندہ وقت وہ لمبی سی گردن میں نرخرے کو یوں اوپر نیچے کرتا رہے گا جیسے فُل بائل انڈا حلق میں پھنس گیا ہو ـــــ کرسی کے کنارے پر بے تابی سے بیٹھ کر کرسی کا پینٹ ناخن سے چھیلتے ہوئے بولا:

"شادی اپنی پسند کی ہونی چاہیے جس میں عورت اور مرد اپنی پسند سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیں ـــــ"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر عورت بالآخر عورت ہے اور ہر مرد بالآخر مرد ہوتا ہے اور اسے عورت سے جنسی لگاؤ کے علاوہ اور کچھ درکار نہیں ہوتا ـــــ"

اسے میری بات سُن کر یکدم ٹھنڈا پسینہ آ گیا:

"تم بالکل وحشی ہو ـــــ وہی وحشی جس نے حضرت حمزہؓ کے پیٹ میں برچھا مار کر انہیں شہید کیا تھا ـــــ"

میں اعجاز کی دو باتوں سے مرعوب رہا ہوں۔ ایک تو جس طرح سچے جذبے اور نیکی کے ساتھ وہ عورتوں کے لیے محسوس کرتا ہے اور دوسرے جس طرح وہ قدم قدم پر مسلم ہسٹری سے حوالے دے کر دوسرے کو بے زبان کر دیتا ہے۔ مجھے یکدم لگا میں ایک گوریلا ہوں جو ابھی ابھی غاروں سے نکل کر باہر آیا ہوں۔ بقول اعجاز ہی، ابوسفیان کی وہ سفاک بیوی ہندہ ہوں جو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبا چاٹ گئی تھی۔

"عورت بہت مظلوم ہے ـــــ"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مرد پہلے اس کے ساتھ من مانی کرتا ہے اور پھر اُسے بے رحم معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے ـــــ"

"ہاں یار ـــــ" میں نے ملزموں کی طرح سر جھکایا۔

"اب اس سے بڑا اور کیا ظلم ہے کہ پہلی رات بغیر جانے بوجھے دولہا اپنی دولہن سے جسمانی بے تکلفی برتے ـــ خود بتاؤ عورت کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی ـــ"

میں عورت کے دل کی بات تو نہیں جانتا تھا لیکن چونکہ اعجاز کہہ رہا تھا کہ یہ ظلم ہے اس لیے میں نے جلدی سے کہا:

"واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے ـــ"

"میں تمہارے پاس اس لیے حاضر ہوا تھا کہ تم میرا ساتھ دو ـــ"

کانپتی آواز میں میں نے سوال کیا ـــ "کیسا ساتھ؟"

"ہم اپنی ہونے والی بیویوں کو نہیں جانتے ـــ"

"نہیں جانتے ـــ"

"اور ہمیں انھیں جانے بغیر اُن سے کسی قسم کے وحشی فعل نہیں کرنے چاہییں۔"

"نہیں کرنے چاہییں ـــ"

"تو یوں طے پایا کہ جب تک ہم ان سے یعنی تم اپنی بیوی کے ساتھ اور میں اپنی بیوی کے ساتھ مکمل طور پر گھل مل نہ جائیں تب تک ہم ان سے جسمانی بے تکلفی نہ کریں گے۔"

میں تو سر سے پیر تک لرز گیا ـــ اب خدا جانے دولہن بیگم کیسے مزاج کی ہوں ـــ گھنٹوں کی راہ پل میں طے کرنے والی یا دنوں کے راستے کو برسوں پر پھیلانے والی۔ کون جانے ان کی شخصیت پیاز جیسی ہو۔ پرت پر پرت کھولتا رہوں اور اندر سے کچھ بھی نہ نکلے۔

"خاموش کیوں ہو تم ـــ میرا خیال ہے مکمل واقفیت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ درکار ہوں گے۔"

"چھ ماہ ـــ!"

میرا جی چاہا کہ کہوں ـــ تو چلو میں چھ ماہ بعد شادی کروا لوں گا لیکن جس طرح گل باگل انڈا اس کی گردن میں اوپر نیچے پھدک رہا تھا اسے دیکھ کر بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"لیکن کم از کم دو ماہ کا وعدہ تو تم مجھ سے کرو"۔

اس نے رومال والی جیب سے ایک منٹے سے حجم کا قرآن کریم نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو سے اس قدر نہ بوکھلایا تھا جتنا اس مختصر سائز کے قرآن کریم کو دیکھ کر بدکا۔

"دو مہینے میں وہ خود ایسی باتوں پر مائل ہو جائیں گی اور جب تک عورت خود مائل نہ ہو اس سے کوئی تعلق رکھنا بیکار ہے ——"

"بالکل بیکار ہے ——"

اعجاز میرے حلفیہ بیان کے بعد دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا —— "میں نے تمہارے متعلق سارے نظریے بدل لیے ہیں۔ خدا کی قسم! تم سر سے پیر تک جنٹلمین ہو —— مجھے تو شبہ تھا بلکہ میں ڈر رہا تھا کہ اگر تم نہ ملنے تو کیا بنے گا ——"

خیر اس کے بعد جو کچھ بنا —— اس کی تفصیل ناگفتہ بہ ہے۔

اعجاز کی بیوی ہفتہ بھر کے بعد میکے جا بیٹھی اور اعجاز مکمل طور پر نفسیاتی کیس بن گیا۔ جو بھی اس کے سسرال جاتا تھا ایک ہی بات لے کر واپس آتا تھا کہ اعجاز کے سسرال والیاں سمجھتی ہیں کہ اعجاز سرے سے مرد ہی نہیں ہے۔ عورت سے ہمدردی کرنے کا جو صلہ اسے مل رہا تھا اس پر ہم دل ہی دل میں خوش تھے اور ہم نے چونکہ اپنی بیوی کو اپنے حلفیہ وعدے کی ساری کہانی من و عن سنا دی تھی اس لیے وہ منہ میں مصری لیے بیٹھی تھیں اور روز کیلنڈر کا صفحہ الٹاتے ہوئے الحمد للہ پڑھا کرتی تھیں۔

کس طرح پورے بیس دن بعد اعجاز صاحب کی بیوی کمال منت و سماجت کے بعد واپس آئی اور کس طرح اعجاز کو اس سے مجبوراً بے تکلف ہونا پڑا، یہ ایک دوسری داستان ہے اس روز جب بھابی دوبارہ گھر آئی ہے تو اسی رات اعجاز مجھے ملنے آیا۔ بے چارہ باسی کیک کی طرح نہایت بے رونق ہو رہا تھا۔

"ایک بات ہے بھائی ــــ"

"فرمائیے ــــ"

"تم مجھے میرے وعدے سے رہا کردو ــــ جیسا میں نے تمہیں معاف کیا"۔

"کیا مطلب ــــ ؟"

"مطلب یہی کہ میں اپنا وعدہ نبھا نہیں سکتا ــــ اگر تم مجھے رہا کردو گے تو میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرے گا ــــ"

"ضمیر کو گولی مارو یار ــــ"

"عجیب سی بات ہے ــــ میں تو سمجھتا تھا کہ عورت فقط پاک محبت کی طالب ہوتی ہے مرد سے ــــ"

"اس کی بھی طالب ہوتی ہے ــــ لیکن بعد میں ــــ"

"تم ــــ تم مجھے رہا کردو ــــ"

"بھائی رہا ہی رہا ہو ــــ"

اس واقعے کو بیان کرنے سے فقط ایک ہی بات مقصود تھی کہ ہماری بیوی نے شادی کے بعد پورے اکیس دن ہمارے نامرد ہونے کا اعلان کسی سے نہیں کیا۔ غالباً یہ عورت کی معراج ہے کہ وہ اتنی بڑی بات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اگر وہ بھی اپنی بہن کی طرح ہوتی تو آج چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کے شوہر کے متعلق بھی یہی مشہور ہوتا کہ برے کاموں کی وجہ سے یہ حضرت شادی کے وقت شادی کے قابل نہ تھے۔

لطف کی یہ بات ہے کہ وہی میری بیوی جو اتنے بڑے راز کو اکیس دن بیٹھی سیتی رہی اب اس کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی بات کو بکھان بنا لیتی ہے۔ پھر اس کتھا سے ہر آنے جانے والے کے لیے چلغوزے، مونگ پھلی کا ایک طشت سجایا جاتا ہے بطور توضیع ــــ

میرا کوٹ کیا آیا محلے کی عورتوں نے اسے چھوا، دیکھا اور اس کی قیمت پوچھی۔ اسی

چھان پھٹک میں اس کی اندرونی جیب سے تین چابیاں برآمد ہو گئیں۔ لنڈے کے ایک پرانے کوٹ میں سے تین چابیوں کا برآمد ہونا معمولی سی بات ہے۔ سنا ہے خوش نصیبوں کو اس میں سے ڈالر ملتے ہیں اور بدنصیبوں کو گیسولین کی پرچیاں۔

چھوٹا امریکی خوبصورت چھلا لے کر میری بیوی میرے پاس آئی اور بولی:

"یہ کوٹ کہیں خلیق نے استعمال کے بعد تو تمہیں نہیں دیا؟"

"کمال کرتی ہیں آپ۔ بتا تو چکا ہوں کہ ان کے ماموں کویت سے لائے ہیں۔ دو ہمشکل کوٹ تھے اس لیے ایک میں نے لے لیا۔"

"تو پھر یہ چابیاں کیسی تھیں بیچ میں۔"

"چابیاں اتنی خوبصورت تھیں اور ان کا چھلا اس قدر نادر کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر چابیاں اس سے لیتے ہوئے کہا:

"واہ! یہ کہاں سے ملیں تمہیں ـــــ یہ تو میری چابیاں ہیں دفتر کی۔"

میری بیوی کے ماتھے پر گہری شکنیں پڑ گئیں:

"آپ کی چابیاں؟ ـــــ آپ نے تو کبھی ذکر نہیں کیا ان چابیوں کا۔"

"دفتر کی جو ہوئیں ـــــ ایک تو بیورو کی ہے۔ ایک میرے ڈسک کی اور ایک صاحب کے سیف کی ـــــ"

"دکھائیے ـــــ"

میں نے چابیاں اس کی تحویل میں دے دیں۔

"کیا رکھتے ہیں آپ کے صاحب اپنے سیف میں؟"

شامتِ اعمال سے میں نے کہا: "کچھ تو کانفیڈنشل فائلز ہیں اور کچھ صاحب کے پرائیویٹ خطوط ہیں۔"

"پرائیویٹ خطوط ـــــ؟ گھر کیوں نہیں رکھتے؟ ـــــ"

"کمال ہے! ایسے خط گھر پہ تھوڑی رکھے جا سکتے ہیں ——"

"اچھا —— چچا!"

کوٹ تو اب ہماری زندگی کے درمیان سے یکسر نکل گیا اور یہ چابیاں درمیان میں غالب کے سر سے گرے بوجھ کی طرح آ گریں۔

جب عورت نانی دادی ہو کر مرد پر شبہ کرتی ہے تو اس کے لچھن ہی بدل جاتے ہیں۔ اب اگر میں وہ چابیاں سنبھال کر رکھتا تو مجھے طعنے ملتے کہ ہاں ہاں جی! سنبھال کر رکھیے۔ کسی کے ہاتھ لگ گئیں تو کہیں اصل پول نہ کھل جائے۔ اگر میں اپنی لاتعلقی سے میز پہ یا کسی اور جگہ چھوڑ جاتا تو بڑے اہتمام سے واپس لا کر مجھے دے جاتیں اور تاکید سے کہا جاتا —— "اب یہ چابیاں کوئی اِدھر اُدھر پھینکنے والی چیز ہیں۔ آپ بھی حد کرتے ہیں"۔

مجھے بیٹھے بٹھائے چابیوں کا آزار ہو گیا۔ رات کو سوتا تو انہیں تکیے کے اوپر پاتا —— صبح اٹھتا تو انہیں شیو کے گرم پانی کے ساتھ پڑا پاتا۔ دن میں کئی بار مجھے پکڑائی جاتیں اور کئی بار میں انہیں امانتاً اپنی بیوی کے پاس رکھتا۔ کوٹلا چھپاکی کے کوٹلے کی طرح ہر بار جب یہ چابیاں مجھے نظر آتیں تو مجھے لگتا کہ اب یہ کوٹلا میری کمر پہ پڑا کہ پڑا ——

تین خوبصورت سٹین لیس سٹیل کی چمکتی ہوئی بے زبان چابیاں! ——

میں رات کو کبھی کبھی ان کا گول چھلا ہاتھوں میں گھما کر دیکھتا۔ ایک چابی ذرا لمبی تھی اور دروازے کے تالے کی نظر آتی تھی۔ میں اسے دیکھتا تو خواب کی آنکھ میں وہ ایک طاق کھول کر مجھے ایک ایسے کمرے میں راہ دیتیں جو شاید کوٹ والے کا اپارٹمنٹ تھا۔ دیواروں پر لگا ہوا گرے رنگ کا وال پیپر۔ کوٹ اور ٹوپی لگانے والا ہینگر۔ خدا جانے اس چابی کا مالک نوجوان تھا کہ بوڑھا —— خدا جانے شادی شدہ تھا کہ مجرّد —— کون جانے عیاش ہو اور یہ چابی دراصل کسی اور اپارٹمنٹ کی ہو جس میں وہ ہر ہفتے محض ویک اینڈ منانے جاتا ہو —— !